ادا جعفری کی خود نوشت ”جو رہی سو بے خبری رہی“ کا تنقیدی مطالعہ

شازیہ بتول*

Shazia Batool

ڈاکٹر شبیر احمد قادری**

Dr. Shabbir Ahmad Qadri

Abstract:

Ada Jafaery (1924-2015) one of the most prominent features of contemporary urdu literature in modern era. Her poetic quest which spanes over seven decades, started when she was only nine and wrote her first verse. She broke the ice in feminest cader by composing her ghazals and poems in form of a book named by "Main Saaz Dhoondti Rahi". She is not only a good poetess but also a versatile prose writer. She published an interesting autobiography "Jo Rahee So Bekhabrey Rahee". It seems a brief description of her personal experiences, progressive poetical approach toward life and society, political exposure, feminest thoughts and ideas.

اردو کی خود نوشت سوانح عمریوں میں ایک دلچسپ اور خوبصورت اضافہ ادا جعفری کی آپ بیتی ہے، ان کی آپ بیتی کی یہ کتاب ”جو رہی سو بے خبری رہی“ مکتبہ دانیال نے کراچی سے ۱۹۹۵ء میں شائع کی، اور یہ ۳۷۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ خود نوشت کا نام مشہور کلاسیکی شاعر سراج اورنگ آبادی کی خوب صورت غزل سے مستعار لیا گیا ہے:

خبرِ تحیرِ عشق سن، نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو، تُو رہا، نہ تو میں رہا، جو رہی سو بے خبری رہی

انھوں نے بچپن سے لے کر آخر تک کے حالات اتنے سلیقے سے اور اتنی سچائی سے رقم کیے ہیں اسے آئندہ خود نوشتوں کے لیے مثال قرار دیا جاسکتا ہے، نثر میں ان کا اسلوب بانکا اور سجیلا ہے، آپ بیتی کا فن دلچسپ اسلوب کا متقاضی ہے، خود نوشت کے فن میں تین اہم عناصر ہیں، لکھنے

☆ پی ایچ۔ڈی سکالر، شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

☆☆ ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

والے کی یاد داشت، لکھنے والے کا اسلوب اور لکھنے والے کے ارد گرد کا حلقہ رجال واحباب، اخفائے ذات سے انکشاف ذات کے مراحل طے کرنے کے لیے عمدہ اسلوب کو بہت اہمیت دو گونا ہے، انھوں نے ایک ایسا اسلوب اول تا آخر اپنائے رکھا ہے کہ قاری پوری کتاب پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا، انھیں خود اپنے فن کا احساس ہے، الفاظ کے انتخاب اور ترتیب الفاظ پر قدرت حاصل ہے، بعض الفاظ اور اشعار طبع سلیم پر گراں گزرتے ہیں لیکن وہ واقعات سے مطابقت رکھتے ہیں اور موقع محل کے لحاظ سے پر زور نثر کی بہار دکھلاتے ہیں، چونکانے والے جملوں اور بے باکانہ پیرائے اظہار نے اس خود نوشت کو قاری کے لیے دلچسپ بنادیا ہے، نثر کی خصوصیات میں سب سے اہم خصوصیات بے خوفی اور بے باکی ہے، ہر شخص اور ہر واقعے کے بیان میں صاف گوئی سے کام لیتی ہیں، ادا جعفری نے اپنی اس آپ بیتی کو لکھنے میں ایک عمر گزاری ہے اور اس عمر کی قیمت ادا کی ہے، اس قیمت کا حاصل یہ خود نوشت ہے، زندگی کے سرد و گرم سہنے کے بعد جب کوئی شخص اس قابل ہوتا ہے کہ مڑ کر بیٹے ہوئے لمحوں سے کچھ کشید کر سکتے تو یہ کوئی معمولی بات نہیں ہوتی، نہ ہی کس و ناکس کو اس کا حوصلہ ہے۔ اس خود نوشت کے ۲۹ باب ہیں اور ہر باب کا ایک عنوان ہے۔ ہم ہر باب کا مختصر سا جائزہ پیش کرتے ہیں۔

اس خود نوشت کتاب کا پہلا باب ''بڑی حویلی '' ہے۔ اس باب میں ادا جعفری نے اپنے بچپن کے دنوں کی یاد کو تازہ کیا ہے، اس پوری خود نوشت میں انھوں نے اپنی تاریخ پیدائش یا سن کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ یہ تو پتہ چلتا ہے کہ ادا جعفری کی پیدائش ہندوستان کے صوبہ اتر پردیش (یوپی) کے ایک مشہور شہر بدایوں میں ہوئی۔ ادا جعفری بڑی حویلی ''ٹونک والا خاندان'' میں پیدا ہوئیں، خاندانی رسومات کے تحت ان کی والدہ شادی کے بعد میکے ہی میں رہیں جب کہ ان کے والد مولوی بدرالحسن کانپور میں ملازمت کرتے تھے، ادا بدایوں میں اپنے نانا کے گھر میں پیدا ہوئیں، وہ اپنی پیدائش کے بارے میں اپنی کتاب ''جو رہی سو بے خبری رہی'' میں لکھتی ہیں:

> ''میں بڑی حویلی میں پیدا ہوئی۔ عجیب حقیقت ہے کہ بڑی حویلی کو اپنا گھر کہتے ہوئے ایک سفاک یاد میرے روبرو آجاتی ہے۔ جب مجھے اچانک احساس ہوا تھا کہ میں یہاں رہتی ہوں لیکن یہ میرا گھر نہیں ہے۔''(۱)

فاطمہ حسن ''غزل نما'' کے دیباچے میں ادا جعفری کی پیدائش ۲۲/اگست ۱۹۲۷ء لکھتی ہیں(۲) ممتاز مفتی اپنے ایک مضمون ''ادا جعفری'' میں ادا جعفری کی پیدائش ۲۲/اگست

۱۹۲۶ء لکھتے ہیں، [۳] احمد حسین صدیقی ''دبستانوں کا دبستان'' میں ان کی پیدائش ۲۲/ اگست ۱۹۲۴ء لکھتے ہیں، [۴] علیم صبا نویدی اپنی کتاب ''پاکستان میں اردو شاعری'' ادا جعفری کی پیدائش ۲۳ اگست/ ۱۹۲۴ء لکھتی ہیں، [۵] شہید حسین بدایونی ''تذکرہ شعرائے بدایوں'' میں ادا جعفری کی پیدائش ۲۲/ اگست ۱۹۲۴ء لکھتے ہیں، [۶] جب کہ ان کے شناختی کارڈ کے مطابق ۲۲/ اگست ۱۹۲۴ء ہے اور اسی کو مستند مانا جاتا ہے۔

اس باب میں وہ اپنے باپ کی بیماری کے ذکر کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہیں کہ بدایوں میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کا مولد اور بہت سے بزرگان دین اور شہدا کا مدفن ہے اور اسی نسبت سے بدایوں کو مدینہ الاولیاء، پیراں شہر اور گنج شہیداں کے ناموں سے بھی پکارا جاتا ہے، وہ اس زمانے میں بڑی باقاعدگی کے ساتھ روزنامچہ لکھا کرتی تھیں، شادی بیاہ کی رسموں کے ساتھ کچھ جاگیرداری نظام کے بارے میں ذکر ہوا ہے، ان سطور میں بچپن کی یادیں بول اٹھی ہیں:

> ''مجھے وہ گھر بھی یاد ہے۔ چھوٹا سا آنگن،، آنگن کے اطراف دالان اور دالان کے پیچھے کمرے۔ ایک پتلا سا زینہ چھت پر جاتا تھا۔ میری دونوں بڑی بہنیں، سلائی سیکھتیں یا پڑھائی میں مصروف رہتیں۔ میں ان کے کمرے میں جاتی تو مجھے باہر نکال دیا جاتا۔ یری یادوں کے اس مرقع میں جہاں محبتیں اور شفقتیں ہیں وہیں مجبوریاں اور محرومیاں ہیں۔ وضعداریاں بھی ہیں اور کم نگاہیاں بھی۔ حویلی میں اذانوں کے اجالے تھے، دعاؤں کے سویرے تھے۔ مگر طاقتوں میں شرافت، امارت اور روایت کے بُت بھی سجے ہوئے تھے۔ میری یادوں میں کچھ تصویریں زوال آمادہ جاگیرداری نظام کی ہیں۔ جاگیریں نسل در نسل مقدمہ بازی کی نذر ہوتی چلی جارہی تھیں۔ رقص و سرود کی محفلیں منعقد کی جاتیں، مجرے ہوتے کیوں کہ یہ بھی شرفا اور امرا کی شان اور پہچان کے لوازم تھے۔'' [۷]

''گوشۂ عافیت'' میں حویلی کے اوپری حصے میں پرانی کتابوں، ادبی رسائل اور مخطوطوں کا ایک ڈھیر تھا، وہ ان کتابوں کی دریافت سے بہت خوش تھیں کیوں کہ بچپن میں ان کا بہترین مشغلہ ان کتابوں کو پڑھنا اور لغت کے الفاظ کو یاد کرنا تھا، وہ انسانوں کی نسبت کتابوں کی قربت میں لطف محسوس کیا کرتی تھیں، دس بارہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا، یہ شعور کی سیڑھی پر پہلا قدم تھا،

اس باب میں لائبریری کے ساتھ نانا کی محبتیں اور رحمتی جو گھر میں کام کرتی تھی اس کا بھی ذکر ہے، کتب بینی کے حوالے سے لکھتی ہیں:

"چھوٹی حویلی کی چھت کے اوپر جو لکڑی کا برآمدہ میری خفیہ لائبریری بن گیا تھا۔ اپنے بزرگوں سے چھپ کر دوستی اور رفاقت کی تلاش میں کتابوں کے پاس جانا بڑی دلکش اور محبوب مصروفیت تھی۔ شاید کبھی انھوں نے بھی اسی طرح دوستی اور رفاقت تلاش کی ہو۔ یہ کتابیں جن کے اوراق وقت کی سنگین بے حسی نے بوسیدہ کر دیے تھے میرے لیے محبت بھرے لمس کا اثر رکھتی تھیں۔ میں نے حرف کی سرگوشیاں سنی تھیں۔ لفظ کو اپنے بھید بتائے تھے۔ میں نے کتاب کو انسان کے مقابلے میں حیات سے قریب تر دیکھا تھا۔ جب میں اندھیروں کے جنگل میں کھو گئی تھی اور میں نے جگنوؤں سے اجالا چاہا تھا تو یہ میرے رہنما بن گئی تھی۔" (۸)

اس باب میں انھوں نے اپنے بچپن کی یادوں پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ اپنے والد کے انتقال کے بعد کھوئی کھوئی اور اکیلی رہ گئی تھی تو وہ اپنی امی جان کی اجازت سے گھر میں کام کرنے والی رحمتی کے گھر چلی جایا کرتی تھی، وہ رحمتی کے بارے میں لکھتی ہیں:

"رحمتی شروع سے ہی میری دیکھ بھال کے لیے نوکر رکھی گئی تھی لیکن اس کی نوکری کا دھاگا ٹوٹتا اور جڑتا رہتا تھا، کبھی وہ طویل عرصے کے لیے غائب ہو جاتی اور پھر اچانک ایک دن آ کر اپنا کام اور مقام دونوں حاصل کر لیتی۔ وہ ہمیشہ لُٹی پِٹی اُجاڑ صورت لیے دروازے میں داخل ہوتی۔" (۹)

اس میں 'ماموں بھانجے کا مزار، مذہبی تہواروں اور کچھ خاندانی یادوں کا ذکر ہے، بدایوں "پیراں شہر" اور "گنجِ شہیداں" کہلاتا تھا، ٹونک والا خاندان پیر کے معاملے میں بھی خود کفیل تھا، 'ماموں بھانجے' کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ یہ دونوں بزرگ سالار شہید غازی کے ہمراہیوں میں سے تھے اور حق و باطل کے معرکے میں شہید ہوئے تھے، ادا جعفری اس حوالے سے لکھتی ہیں:

"مجھے معلوم نہیں کیوں یہ دستور تھا کہ بدایوں میں جب کسی گھر میں ولادت ہوتی تو چِلہ نہا کر ماں اور بچہ سے پہلے 'ماموں بھانجے' مزار پر حاضر ہوتے۔ یہ حاضری عشاء کی نماز کے بعد ہوتی تھی۔ عشاء کی نماز کے بعد ماں اپنے بچے کو لے کر کسی بزرگ خاتون اور بڑے بچوں کے ساتھ اس مزار پر آتی۔ ایک دَونے میں بتاشے یا مٹھائی

اور کبھی کبھی پھول بھی ہوتے جو وہاں رکھ دیا جاتا۔ مزار سے خالی ہاتھ واپس جانا ماں اور بچے کے لیے بُرا شگون سمجھا جاتا۔ یہ تمام رسم انتہائی خاموشی سے ادا ہوتی۔"(۱۰)

وہ اپنے گھر میں صبح کی سرگرمیاں اور اپنے خاندان کی عورتوں کے حوالے سے لکھتی ہیں:

"بدایوں کی چند محبوب یادوں میں ایک میری نانی کی یاد ہے۔ جس آواز سے ہر صبح ہماری آنکھ کھلتی وہ ان کی تلاوتِ کلام پاک کی خوش لحن، مدھم، شیریں آواز تھی، دالان میں ایک در میں ان کی نماز کی چوکی بچھی رہتی جس پر سفید شفاف دوپٹے سے اپنے سفید شفاف بال بڑی احتیاط سے ڈھانکے ہوئے، انھیں تلاوت میں مصروف دیکھنا ہمارے لیے گویا صبح کی آمد کا اعلان ہوتا تھا۔ نانی فارغ اوقات میں قصص الانبیا پڑھتی رہتیں۔ لکھنا نہیں جانتی تھیں۔ میری حقیقی خالہ ایک ہی تھیں۔ ان کا نام صفیہ تھا۔ شادی نہیں ہوئی تھی۔ سر کے بال سفید ہو گئے چکے تھے لیکن ان کا شمار لڑکیوں میں ہوتا تھا۔ ہم لوگ بھی انھیں سہیلی کا درجہ دیتے تھے۔ کوئی بچہ بیمار ہوتا، روتا تو وہ اسے رات رات بھر گود میں لیے ٹہلاتی رہتیں۔"(۱۱)

سلمان غازی ادا کے نام خط میں لکھتے ہیں:

"سوانح کے آغاز میں بدایوں کا حال آپ نے بہت خوبصورتی سے لکھا ہے یہ اتنا عمدہ ہے کہ قاری خود کو ایک کردار سا محسوس کرنے لگتا ہے، اس حصہ میں آپ کی نثر اپنے عروج پر ہے، اتنی اچھی کتاب لکھنے پر مبارک باد قبول فرمائیے، پاکستانی ادبی کتب یاں آسانی سے دستیاب نہیں، آپ کے شعری مجموعہ بھی نہیں ملتے البتہ دینی کتب کے ایڈیشن دھڑلے سے چھپتے اور بکتے ہیں، میں نے آپ کی سوانح علی گڑھ سے خریدی تھی، اسے ختم کیا ہی تھا کہ روزنامہ "انقلاب" نے اسے قسط وار شائع کرنا شروع کر دیا، اس طرح ایک بار اعادہ بھی ہو گیا، دوسری بار پڑھنے میں بھی وہی لطف آیا۔" (۱۲)

اس باب میں انھوں نے اپنے بچپن کی یادوں کے ساتھ اپنی تعلیم کی باتیں لکھی ہیں، رسم و رواج اور رہن سہن کے بارے میں بارے میں بھی آگاہی دی ہے، شہر کے جو قابل ذکر خاندان تھے ان میں مردوں کے لیے عربی خصوصاً فارسی زبان پر عبور حاصل کرنا لازمی تھا کہ یہی شرفا کی پہچان تھی، صاحب ثروت لوگوں کے ذاتی کتب خانوں میں نادر کتابوں اور مخطوطوں کے ذخیرے ہوتے تھے، تعلیم کا احوال کچھ یوں لکھتی ہیں:

"وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بدایوں میں انگریزی تعلیم کی ضرورت کو بھی تسلیم کر لیا گیا تھا لیکن اب بھی لڑکیوں کے لیے اسکول کا ہر دروازہ بند تھا، میری امی کے تایا مولوی وزیر حسن بدایوں کے پہلے گریجویٹ تھے۔ میرے تین ماموں تھے جن میں مولوی خلیل احمد اور مولوی عبدالرؤف وکیل تھے۔ بڑے ماموں مولوی محمد مسعود جائداد کی دیکھ بھال کرتے تھے۔"(۱۳)

پانچویں باب میں ادا جعفری نے اپنے خاندان کے بارے میں روایت پسندی کی بات کی ہے، لڑکیوں کی تعلیم، مردوں کے حاکمانہ رویے، جاگردارانہ سوچ، رسومات کو بیان کیا ہے، باغیانہ طرز فکر، فطری نسائی کی بھی بات کی ہے، شادی صرف خاندان کے اندر ہی کی جاسکتی تھی، خواتین قرآن مجید کے بعد اردو پڑھنا لکھنا سیکھ لیتی تھیں، اسی باب میں چار مغربی شاعرات روس کی شاعرہ کیرولینا پاولوو (۹۳۔۱۸۰۷ء)، فن لینڈ کی شاعرہ لیرین لیر اسکی (۱۹۰۴ء۔ ۱۸۳۳ء)، انگلستان کی مشہور ناول نگار اور شاعرہ ایملی برانٹے (۴۸۔۱۸۱۸) اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی غیر روایتی اور غیر معمولی شاعرہ ایملی ڈکسن (۸۶۔ ۱۸۰۳ء) کے بارے میں بات کی ہے۔ انھوں نے متاخر الذکر شاعرات کے حالاتِ زندگی اور شعری تخلیقات کا نہایت عمدگی سے تجزیہ پیش کیا ہے جو مصنفہ کے وسعتِ مطالعہ اور مردم شناسی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

چھٹا باب "روشنی کی لکیر" کے عنوان سے ہے اس باب میں انھوں نے اپنے والدہ کے با ہمت ہونے کے بارے میں ذکر کیا ہے، جنھوں نے حالات کی ہر آزمائش کو برداشت کیا ہے، ٹانک والا پھاٹک کے اندر رہنے والے ایک طے شدہ ضابطہ حیات کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے، جہاں روایت شکن قسم کے فیصلے مرد خود اپنے لیے نہیں کر سکتے تھے، وہاں عورتوں کے لیے تو سانس لینے کے آداب تک مقرر تھے، ایسے میں وہ ہستی صرف ماں کی تھی جس نے نسل در نسل بڑی استقامت اور صبر کے ساتھ اپنی بیٹیوں کے لیے ایک خاموش اور مسلسل جہاد کیا، بیوگی کی سفید چادر سر پہ تانے ایک نومولود بیٹے اور تین بیٹیوں کی پرورش، پرداخت اور تربیت کی چٹانیں بھی سامنے سر اٹھائے کھڑی تھیں جنھیں سر کرنا تھا، باپ کے سائے سے محروم بچوں کو اپنی زندگی، اپنی ہی دھوپ اور اپنی ہی چھاؤں میں بسر کرنا سکھانا تھا، اپنے بچوں کا حال اور مستقبل سنوارنے کے مراحل بھی تھے جو بڑے حوصلے اور مستقل مزاجی کے ساتھ انھوں نے طے کیے، وہ لکھتی ہیں:

”میری عبادت گزار کم گو اور صابر ماں غم کی آگ میں تپ کر بے شک کندن ہو گئی تھیں۔ پورے خاندان کے لیے ان کا وجود ایک رحمت تھا۔“ (۱۴)

اس ساتویں باب کا عنوان ہے ”سفر شرط ہے“۔ باب کے شروع میں سفر کی حکایت بیان کی ہے، زندگی ایک سفر ہے ایک کے بعد دوسرے سفر کی نوید انسان کو تر و تازہ رکھتی ہے اور منزل کی لگن انسان کو تھکنے نہیں دیتی، وہ اپنے بہنوئی کے بارے میں لکھتی ہیں کہ انھوں نے ان کی بڑی حوصلہ افزائی کی ہے اور انھوں نے ان کے شوق سخنوری کو سنوارنے اور نکھارنے میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ سیتا پور کا قیام ان کے لیے کچی نیند سے جاگنے جیسا تھا اور پھر ان کے بہنوئی جمال صاحب کے ذریعے ہی اثر لکھنوی سے ان کا تعارف ہوا، وہ اپنے بہنوئی جمال احمد رضوی کے بارے میں لکھتی ہیں:

”جمال بھائی نے میرے ذوق شعر گوئی کے پنپنے کے لیے ہر ممکن سہولت فراہم کی۔ وہ شاعر نہیں تھے لیکن میری شاعری انھیں محبوب تھی۔ ایک بار ناسمجھی کی عمر میں جب میں کھو گئی تھی تو امی نے میرے سامنے پنسلوں اور کاپیوں کے ڈھیر لگا دیے تھے۔ اب جمال بھائی نے میرے مطالعے بل کہ تربیت ذوق کے لیے کتابوں کے ڈھیر لگا دیے۔ کلاسیکی ادب سے مجھے انھوں نے ہی آشنا کیا۔ انھیں کی رہ نمائی میں میں نے اردو، فارسی اور انگریزی ادب کا مطالعہ کیا۔“ (۱۵)

اس باب میں ادا نے ترقی پسند تحریک کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ادا جعفری کے عہد کے اسی منظر نامے میں ترقی پسند تحریک بڑی شد و مد سے جاری تھی، نئے اذہان کا اس طرف مائل ہونا فطری امر تھا، وہ رسمی طور پر اس تحریک کی کارکن نہیں رہیں، نہ ہی انھوں نے تحریک کے جلسوں یا مشاعروں میں شرکت کی لیکن ترقی پسند رسائل و جرائد میں ان کا کلام تواتر سے شائع ہوتا رہا، ادا کو ترقی پسند سیاسی نظریات سے اختلاف تھا، انھوں نے اس تحریک کی مثبت ادبی روایات کو قبول کیا، وہ لکھتی ہیں:

”میرے اشعار ترقی پسند ادیبوں کے رسائل میں شائع ہو رہے تھے۔ ترقی پسند ادیب کے جو انتخاب شائع ہوتے ان میں بھی میری نظمیں شریک اشاعت ہوتیں۔ ”نئے زاویے“ کا نام مجھے یاد ہے جسے کرشن چندر مرتب کرتے تھے۔ ابھی پچھلے دنوں رسالہ ”نگار“ کا شمارہ (اکتوبر ۸۶ء) دیکھا تو خوش گوار حیرت سی ہوئی جیسے اچانک ماضی کے کسی آوارہ خرام لمحے سے ملاقات ہو گئی ہو۔“ (۱۶)

نویں باب کا عنوان ہے "دشت میں سامنے خیمۂ گل" ہے اس باب میں تحریک پاکستان کا ذکر ہے، برصغیر میں تحریک آزادی کی ابتدا ۱۸۵۷ء میں ہو گئی تھی، دوسری یہ تحریک توانا ہو کر مطالبے تک پہنچ گئی اور پھر اسی تحریک آزادی کی کوکھ سے تحریک پاکستان نے جنم لیا۔ ٹونک والا پھاٹک کے اندر بھی تحریک آزادی نے جو کام نہیں کیا تھا وہ تحریک پاکستان نے انجام دیا۔ اور اب اس ذہنی تربیت نے بھی جو علی گڑھ یونیورسٹی کا عطیہ تھی اور ساتھ ہی اس خاندان کا مذہبی پس منظر، ۱۹۳۵ء میں صوبوں میں کانگرس کی حکومت قائم ہوئی اور مسلمانوں کا اندیشہ حق تلفی بڑھتا گیا۔ ان کا خاندان بھی مسلم لیگ میں شامل ہو گیا، ادا جعفری تحریک پاکستان کے حوالے سے لکھتی ہیں:

> "میری یاد میں ۴۵ء۔ ۴۴ء کا زمانہ ہے جب ملک کی سیاست اور تحریک آزادی سے الگ تھلگ رہنے والا یہ تغیر ناآشنا خاندان جس کے مزاج میں روایت پرستی رچی ہوئی تھی اور جسے صرف اپنے ہی نقش قدم پر چلنے کی عادت تھی ایک سیاسی جماعت مسلم لیگ سے جذباتی اور عملی دونوں لحاظ سے وابستہ ہو چکا تھا۔" (۱۷)

قیام پاکستان کے بعد اتنے بڑے پیمانے پر جو نقل مکانی ہوئی وہ اسی خاں چکاں، آسیب زدہ اور غیر یقینی صورت حال کا نتیجہ تھی، اس حوالے سے لکھتی ہیں:

> "آج لہولہان کراچی میں بیٹھ کر قیام پاکستان کے تاریخ ساز دنوں کو یاد کر رہی ہوں کیسے یقین آئے کہ ایک عالمگیر برادری سے تعلق رکھنے والے وہی لوگ آج بھی ایک عظیم فلسفۂ حیات کے داعی اور پیرکار ہیں، جو دنیا کے نقشے پر ایک غیر معمولی نظریاتی ملک کے معمار ہیں۔" (۱۸)

اس باب میں میں بھی قیام پاکستان کے بعد کا تذکرہ ہے، فسادات میں اغوا ہونے والی بدنصیب بیٹیوں کی بازیابی کا سلسلہ شروع ہوا، تو حساس دلوں نے کچھ صدمے اور سہے، دیکھنے والوں نے یہ بھی دیکھا کہ غیروں کے ہاتھوں سے چُور چُور نڈھال معصومیت کو ایک آخری زخم بھی نصیب ہوا اور یہ آخری بھرپور وار کرنے والے ہاتھ اپنوں کے تھے، اسی باب میں رابعہ کا ذکر ہے جو یونیورسٹی کی طالبہ تھی، فسادات میں وہ ایک سکھ کے حصہ میں آئی، دوسری لڑکیوں کو نہ جانے کون لے گیا، رابعہ مجبور بے بس تھی، ساری رات سکھ اس کی حفاظت کرتا رہا، اگلے دن وہ اسے باحفاظت اس کے گھر پہچانے کے لیے تیار تھا تو رابعہ نے راہبہ بن کر اس سکھ کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کر لیا وہ

کیسے اپنے گھر والوں کو یقین دلاتی کہ میں بے گناہ ہوں، اس ایک رات میں زمانہ بہت آگے نکل چکا تھا، اس بے کسی اور بے بسی میں مسلمان لڑکیوں نے اپنی جان دے دی یا اپنا مذہب تبدیل کر لیا، ادا جعفری لکھتی ہیں:

> ''اس ہجوم میں سب نابینا نہ سہی مگر ایسے ماں باپ بھی سامنے آئے جن کی آنکھیں اپنی مجبور اور مظلوم بیٹی کی پہچان سے عاری ہوئیں ۔ جو اس تار تار آنچل کا بوجھ اٹھانے پر محبت اور شفقت کے کسی رشتے کو آمادہ نہیں کر سکے۔ جب بے بسی گناہ بن گئی اور بے کسی کفارہ نہ بن سکی۔'' (۱۹)

آپ بیتی کا گیارھواں باب ''ورنہ سفر حیات کا بے حد طویل تھا'' ہے، اس باب میں مصنفہ نے خالصتاً اپنی ذاتی زندگی اور معمولاتِ حیات کا ذکر کیا ہے، اپنی ازدواجی زندگی کے ابتدائی معاملات، نئی مملکت کی محبت میں پاکستان کی طرف ہجرت، کراچی میں قیام اور اس قیام کے دوران پیش آنے والی مشکلات کا تفصیلاً ذکر کیا ہے۔ یہ غالباً ۱۹۴۸ء کا دور ہے جب ادا کے ہاں بچے کی پیدائش ہوتی ہے لیکن جلد ہی ان کی گود خالی ہو جاتی ہے۔ اپنے کرب اور تکلیف میں جس طرح ان کے شوہر نے ان کا ساتھ دیا اس کا اظہار کچھ یوں کرتی ہیں:

> ''میں اس وقت ایک عورت کی زندگی کے سب سے عظیم اور سب سے حسین تجربے سے گزر رہی تھی اور میں اکیلی تھی۔ بہت اکیلی اور مجھے اپنے پہلے بچے کی آمد تک بہر حال کراچی میں رہنا تھا۔ زندگی اپنی تمام تلون مزاجیوں اور سب جھمیلوں کے باوجود خوبصورت بھی ہے اور مہربان بھی۔ نور نے سائبان بن کر مجھے موسموں کی شدت سے محفوظ و مامون رکھا ہے۔''(۲۰)

بارھواں باب '' شہر عزیزاں '' ہے، اس باب میں وہ تقسیم ہند سے پہلے اپنے مجموعہ کلام اشاعت کے لیے دیا تھا وہ ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا، اسی باب میں جگر مراد آبادی، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، نجمہ انوار الحق، ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور سے ملاقاتوں کا تذکرہ ہے، ۱۹۶۵ء کی جنگ نے جہاں ہماری پوری قوم کو بیدار کر دیا تھا وہیں اس شاعرہ کو بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیا، سرزمین وطن نے اہل وطن کو آواز دی اور سب نے اپنے مقدور بھر اس آواز پر لبیک کہا، جب ان کے شوہر نورالحسن جعفری کے پھوپھی زاد بھائی میجر ضیاء الدین عباسی نے خاک وطن کو اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا تو انھوں نے ''مرے شہید'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی، جذبات پر پڑی برف پگھل گئی وہ ایک

طویل عرصے کے بعد دوبارہ شاعری کی جانب راغب ہوئیں اور پھر شاعری کا سلسلہ چل نکلا جو گھریلو مصروفیت کی وجہ سے رک گیا تھا، ملاحظہ کریں نظم ''مرے شہید'' کی چند لائنیں:

مرے دلبر، میرے نوجواں، مرے غازی
فنا کی بات نہ چھیڑو، بقا کی ذکر کرو
چراغ اب بھی فروزاں ہے، آنکھ اوٹ سہی
اندھیرا چھٹتا ہے، لو گو ضیا کا ذکر کرو
مرے مسافرِ شہر وفا کا ذکر کرو (۲۱)

اس باب میں وہ خاصی مطمئن نظر آتی ہیں، اس باب میں احباب سے ملاقاتیں ہیں، ادبی شخصیات اور ان کے کارناموں کا بھی تذکرہ شامل ہے، انھوں نے اپنی پوری خود نوشت میں کسی شخص کی برائی، کمزوری یا ذم کا پہلو تحریر نہیں کیا، ان کی کشادہ دلی سب کے عیبوں کو چھپا لیتی ہے، انھوں نے کسی بھی شخص کے بارے میں چند جملے کہے ہیں مختصر ہونے کے ساتھ جامع بھی ہیں، جمیل الدین عالی کے بارے میں لکھتی ہیں:

''عالی جی کی ادبی شخصیت کے بارے میں اختصار کے ساتھ کچھ لکھنا آسان نہیں ہے۔ عظیم اور منفرد شاعر، مفکر اور دانشور، عالی جی ممتاز اور ہمہ جہت حیثیت رکھتے ہیں۔ میں انسانی اقدار کے حوالے سے بھی انھیں بڑا مانتی ہوں۔'' (۲۲)

اس باب میں مصنفہ نے اپنے احباب کی مہربانیوں کا ذکر کیا ہے، زندگی کے میدان حشر میں انھیں اپنی تمام خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود دوستوں بلکہ شناساؤں کا بھی بے کراں خلوص، شجر سایہ دار کی طرح ملا، کراچی، لاہور اور اسلام آباد میں اور بھی جو آئینہ تمثال دوست تھے ان سب کی یادیں گراں بہا سرمائے کی طرح ان کے دل میں محفوظ ہیں، دوستوں کے معاملے میں وہ اور ان کے شوہر نورالحسن جعفری دونوں اللہ کے فضل و کرم سے بہت خوش قسمت رہے ہیں، وہ لکھتی ہیں:

''نثار عزیز بٹ سے پہلی ملاقات لاہور میں ہوئی تھی لیکن ان سے دائمی خلوص اور محبت کے رشتے اسلام آباد میں مستحکم ہوئے۔ نثار زندگی سے صلح کر لینے کا ہنر جانتی ہیں۔ ان کی تربیت یافتہ نگاہ ہر دھندلکے میں اجالا اور ہر نظارے میں حسن تلاش کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔'' (۲۳)

اس پندرھویں باب میں ادا جعفری نے نیو انگلینڈ کی دو خواتین کا ذکر کیا ہے، نیو انگلینڈ کا پورا علاقہ چھ امریکی ریاستوں پر مشتمل ہے، میساچیوسٹس، مین، نیو ہیم پشائر، ورمانٹ، کینک ٹیکٹ اور روڈ آئی لینڈ، ان ریاستوں کے درمیان فاصلہ بھی نہ ہونے کے برابر ہے، مصنفہ ان دونوں شاعرات کے بارے میں لکھتی ہیں:

> ''ایملی ڈکنسن ہے جس ۱۸۳۰ء میں پیدا ہوئی اور بچپن سے اپنی ماں کی محبت اور توجہ سے محروم رہی، وہ یہیں کسی پرچھائیں کی طرح رہی اور ۱۸۸۶ء میں اپنے گھر سے اپنی زندگی کے آخری سفر پر روانہ ہوئی۔ ایملی کی ایک نظم:
>
> ''چوں کہ میں موت کے لیے رک نہیں سکتی تھی
> اس لیے موت خود از راہ کرم میرے پاس آ کر ٹھہری
> رتھ میں صرف ہم دونوں تھے
> اور لامتناہی ابدیت''(۲۴)

وہ دوسری جنگ عظیم کے بعد ابھرنے والی نسل کی نمائندہ شاعرہ سلویا پلاتھ کے حالاتِ زندگی کا نہایت تفصیل سے اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ایک نے زندگی کو گھونٹ گھونٹ کر کے پیا تو دوسری نے ایک ہی سانس میں زندگی کا پیالہ خالی کر دیا:
>
> دل تھم گیا ہے
> سمندر کی لہریں پیچھے ہٹ گئیں ہیں
> آئینوں پر چادریں ڈال دی گئیں ہیں(۲۵)

ادا جعفری نے بھی ان شاعرات کی طرح شاعری اور نثر کے ذریعے عورت پر ڈھائے جانے والے مظالم اور جبر کی داستانیں سنائی ہیں۔ وہ بھی مردوں کی اجارہ داری اور استحصال کے خلاف آواز بلند کرتی نظر آتی ہیں۔ انھیں احساس ہے کہ ہر قوم، نسل اور ہر زمانے سے تعلق رکھنے والی عورت ازل سے اپنے عورت ہونے کے سبب دکھ جھیلتی آئی ہے۔

مصنفہ نے امریکہ میں قیام کے دوران مختلف شہروں کے سفر کیے اور وہاں کی تہذیب کا باریک بینی سے مطالعہ کیا۔ قبیلہ ''آمش'' اسی خطے کا قبیلہ ہے جس پر ابھی جدید دنیا کا اثر نہیں پڑا یا انھوں نے چمکتی دنیا کی نت نئی سہولیات اور آسائشوں کو خود پر حرام کر رکھا ہے۔ انھوں نے اس قبیلے کے بارے میں جتنا تفصیلاً بیان کیا ہے ان معلومات کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ادا جعفری اپنے

ارد گرد کی دنیا کو ایک باہوش اور باشعور فرد کی مانند دیکھتی ہیں، ان کے اندر زندگی اور حرارت ہے، وہ مختلف چیزوں سے دلچسپی کے ساتھ معلومات کے حصول پر توجہ دیتی ہیں۔

اس خود نوشت کا سترھواں باب "سلسلے" ہے۔ اس باب میں اسلام آباد میں منعقدہ ادبی محافل کا ذکر ہے، مصنفہ کی خواہش تھی کہ اہل قلم اپنے ادبی ذوق کی تکمیل کے لیے محدود پیمانے پر ہی سہی، دیگر اہل قلم سے روابط رکھنے اور ان کی فنی کاوشوں سے فیض یاب ہونے کے لیے ادبی محافل کا انعقاد کیا جائے، اس سلسلے میں ایک شام "سلسلہ" وجود میں آ گیا، جس کی ادا جعفری نے تجویز دی اور جو دوست احباب موجود تھے انھوں نے تائید کی اور یوں جمیل نشتر کے گھر "سلسلہ" کا آغاز ہو گیا۔ سلسلہ کا منشور لکھا گیا، خریطہ جس پر اراکین کے دستخط ہونا تھے عذرا عباس نے تیار کیا۔

ابتدا میں "خاصانِ سلسلہ" میں جمیل نشتر، رفعت جمیل، مختار مسعود۔ عذرا مسعود، نثار عزیز بٹ، اصغر بٹ، سید ضمیر جعفری، قدرت اللہ شہاب، آغا ناصر، مسعود مفتی، بشریٰ مسعود، کرنل محمد خان اور دوسرے لوگ شریک ہوئے، دو تین ماہ بعد ممتاز مفتی جنرل شفیق الرحمن، منظور الٰہی اور زہرا بھی ان کے اراکین میں شامل ہوئے۔

کراچی آمد کے بعد ادا جعفری نے یہاں بھی اسلام آباد کی طرز کی ادبی محافل "سلسلہ" کا آغاز کیا، یہاں قریباً بیس کے قریب نامو شاعر ادیب اس تنظیم سے وابستہ ہوئے، کراچی میں وہ جوش خروش نہیں تھا جو اسلام آباد کی محافل میں تھا، کراچی میں مجلس "سلسلہ" کی رونق زیادہ تر مہمانوں کی مرہون منت رہی، جن میں عصمت چغتائی، شوکت صدیقی، فیض احمد فیض، خدیجہ مستور، ساقی فاروقی، ڈاکٹر وحید قریشی، کمانڈر انور اور دور جدید کی منفرد افسانہ نگار زاہد حنا شامل تھیں لیکن ان کی عام محفلوں میں اس چھوٹے سے ادبی حلقے کا ادبی رنگ نکھر کر سامنے نہیں آ سکا۔

اس باب میں بھی ادا جعفری کی یاد داشتوں میں کچھ ملاقاتیں ہیں اور کچھ سیر و تفریح کا تذکرہ ہے۔ لاہور شہر کے تذکرے کے ساتھ انھوں نے دو شخصیات کا خاص طور پر ذکر کیا ہے جن ایک میرزا ادیب اور دوسرے احمد ندیم قاسمی ہیں جنھوں نے ادا جعفری کو بہن کہا اور اور اس رشتے کو نبھایا بھی اسی طرح لاہور میں ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور سے ملاقات ہوتی رہی جو رفتہ رفتہ محبتوں کی امانت دار ثابت ہوئیں، اس باب میں انھوں نے بعض بڑے فنکاروں کا تذکرہ بھی کیا ہے جو مختلف حوالوں سے معاشرے میں معتبر سمجھے جاتے ہیں ان میں ابن الحسن برنی، مشتاق احمد یوسفی، افتخار عارف اور صادقین وغیرہ نمایاں ہیں۔

کراچی، لاہور کے بعد راولپنڈی، اسلام آباد میں ان کا قریباً پانچ سال قیام رہا، اس دوران میں انھوں نے پاکستان کے مختلف شمالی علاقاجات کی بھرپور سیر کی، انھوں نے وہاں کے فطری حسن اور خوب صورتی کو نہایت دل کش انداز میں بیان کیا ہے۔ عالم گیر انسانی جذبات اور احساس یگانگت کے زیر اثر وہ مختلف فرقوں، انسانی گروہوں اور مختلف تہذیبوں کے لوگوں میں بہت سے ایسے مشترک خواص دیکھتی ہیں جو انھیں باہمی قربتوں، رفاقتوں اور محبتوں میں باندھے رکھتے ہیں، وہ لکھتی ہیں:

> ''بچپن ہی سے مجھے ہندوؤں کے تہوار، ہولہ دیوالی وغیرہ بہت دلچسپ نظر آتے تھے۔ مگر ان کا سب سے خوب صورت تہوار راکھی بندھن ہے جو ہر سال ساون کے مہینے میں منایا جاتا ہے۔ اس تہوار کی ندرت کو میں ابھی تک نہیں بھول سکی ہوں۔ اس دن بہنیں اپنے بھائیوں کی کلائی پر راکھی باندھتی ہیں اور ان کی درازی عمر اور خوشیوں کی دعائیں مانگتی ہیں۔'' (۲۶)

اس خونوشت کا بیسواں باب ''کچھ اور یادیں'' کے عنوان سے ہے، اس باب میں ادا جعفری نے ایک بار پھر لاہور کی یادوں کو تازہ کیا ہے، ۱۹۷۶ء کو ایک بار پھر انھیں لاہور منتقل ہونا پڑا، اس بار اسلام آباد کا خوشیوں بھرا ماحول چھوڑنا ان کے لیے اذیت ناک تھا، مگر ہمت حوصلے سے لاہور میں بسیرا کیا اور یہاں بھی ادبی محافل کی بنیاد رکھی، خاص طور پر اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے لیے ہمیشہ کوشاں رہی، حجاب امتیاز علی کے ساتھ مل کر ایک ''تنظیم ''من سلویٰ'' بنائی، حجاب امتیاز علی اس کی پہلی صدر بنیں، پہلی محفل گھر کے کھلے چبوترے پر آدھے مہینے کے چاند کی گواہی میں منعقد ہوئی، مضامین نظم ونثر پڑھنے کے لیے بجلی کا لیمپ روشن کر دیا جاتا، اس تنظیم میں نامور شخصیات شامل ہوئیں جن میں انتظار حسین، کشور ناہید، منظور الٰہی، جمیلہ ہاشمی، محمد طفیل اور صلاح الدین کے نام شامل ہیں، ان محفلوں میں مہمانوں کو بلوا کر رونق میں اضافہ کیا جاتا، ان مہمانوں میں فیض، محمد خالد اختر، احمد ندیم قاسمی اور فاطمہ حسن کے نام نمایاں ہیں، اردو شاعری میں شاعر خواتین اپنی الگ پہچان رکھتی ہیں اور ساکھ بھی۔ اپنا اپنا رنگ سخن اور اپنی اپنی جراتِ اظہار کے حوالے سے وہ اندرونِ ملک اور بیرونِ ممالک بسنے والی مختلف شاعرات کا ذکر کرتی ہیں:

"یہ کہنا ضروری سمجھتی ہوں کہ جن سخن ور خواتین کو میں جانتی ہوں اور جن سے ملاقات ہوتی رہتی ہے ان سب کی جانب سے مجھے ہمیشہ محبت اور قربت کا احساس ہی رہاہے۔ مختلف گروہ یا محاذ صرف مردوں کے علاقے میں ہوتے ہیں۔" (۲۷)

یہ آپ بیتی کا بیسواں باب ہے، اس باب میں سقوط مشرقی پاکستان کے دردناک سانحہ پر بات کی گئی ہے اور مصنفہ نہایت باریک بینی سے بنگلہ دیش کے بارے میں قائد اعظم کے ارادوں اور افکار کا ذکر کرتی ہیں، اس کے ساتھ ساتھ وہ ان سیاسی غلطیوں اور انتظامی جانبداری پر نہایت بے باک انداز میں تبصرہ کرتی ہیں جن کے نتیجے میں وطنِ عزیز دو لخت ہوا اور بنگلہ دیش وجود میں آیا۔ اس سلسلے میں وہ رقم طراز ہیں:

"میں پاکستان کی تاریخ نہیں لکھ رہی ہوں۔ نہ سیاسی نہ لسانی۔ پاکستان کی تاریخ جس نہج پر چلی یا چلائی گئی یہ تمام حقائق تو وہی لکھے گا جو خود ہر قسم کی جذباتی اور ذہنی وابستگی سے آزاد ہو گا۔ چمن آرائی نسلوں کی محنت، ایثار اور لگن چاہتی ہے جب کہ چنگاری صرف ایک ہی بہت ہوتی ہے۔ مشرقی پاکستان میں غربت، مغربی پاکستان سے یقیناً زیادہ تھی جو گلیوں، کوچوں، بازاروں ہی میں نہیں چہروں پر بھی لکھی ہوئی تھی۔ یہ مشرقی پاکستان کا احساس محرومی اور اپنی حق تلفی کا یقین تھا جو اظہار پر مجبور ہو رہا تھا۔ ہمارے بسے بسائے گھر میں زبان اردو بہانہ بن گئی۔ اردو۔۔۔۔ اردو تو آج تک پاکستان میں بھی سرکاری زبان نہیں بن سکی ہے۔" (۲۸)

اس باب میں سفر اور سیاحتیں ہیں جن کا تذکرہ نہایت دلکش انداز میں ملتا ہے، انھوں نے مغربی معاشروں میں مقیم اپنے بچوں سے ملاقات کے لیے کی جانے والی آمد و رفت سے بھی بھرپور استفادہ کیا یوں بھی زندگی نے انھیں اس انداز میں آسودہ حال رکھا کہ مختلف شہروں اور مختلف ملکوں کو دیکھنے اور وہاں کے شب و روز سے نئی تازگیوں کو اپنے وجود میں جذب کرنے سے، وہ زندگی کی یکسانیت سے محفوظ رہیں، اس باب میں انھوں نے بنگلہ دیش، تھائی لینڈ، ہانگ کانگ، جاپان، کے علاوہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی قریبا! تمام ریاستوں کی سیر کی ہے ان ریاستوں میں نیو یارک، واشنگٹن، میری لینڈ، ورجینیا، کولمبیا، میساچیوسٹس، کینسس، کیلی فورنیا، نیو جرسی، والومنگ، منی، سوٹا، کنیک ٹیکٹ، اوہایو، پینسلوینیا، ورمانٹ اور ہوائی کے سفر کا تذکرہ کیا ہے، وہ جہاں بھی جاتیں وہاں کے لوگوں، عمارتوں، بازاروں، ہوٹلوں عبادت گاہوں اور رسم و رواج کے بارے میں ضرور لکھتیں، منظر کشی ملاحظہ کریں:

"امریکہ کا گولڈن گیٹ برج پہلی ہی نظر میں بے حجابانہ سامنے آنے سے کترا رہا تھا۔ فاصلہ کم ہوا تو دنیا کا یہ حسین ترین اور بے نظیر پُل ہوا میں آویزاں ایک عظیم الشان ہلال کی صورت نظر آیا۔ گولڈن گیٹ برج ۱۹۳۷ء میں مکمل ہوا۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا آویزاں پُل ہے۔ جن دو ستونوں کے درمیان فولاد کے صرف دو تاروں کے سہارے خلیج پر اسے تعمیر کیا گیا، ان کی اونچائی سات سو چھیالیس فٹ اور ایک ٹاور سے دوسرے ٹاور تک فاصلہ چار ہزار دو سو فٹ ہے۔"(۲۹)

آپ بیتی کے بائیسویں باب میں سیاحت اور سیاحتی مقامات سے متعلق انھوں نے اپنے تجربات کا نہایت تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

خود نوشت کے تئیسویں باب میں ادا جعفری نے مشرقی اقدار کا مغربی تہذیب سے موازنہ کیا تو انھیں مغرب کے زوال پذیر معاشرے کی اخلاقی گراوٹ کا گہرا دُکھ ہوتا ہے اور متذکرہ معاشرے میں اولڈ ہوم کے بڑھتے ہوئے رجحان اور موت کی راہ تکنے والے بزرگوں کی بے بسی کا شِدت سے احساس ہوتا ہے اور وہ مغربی تہذیب کے مقابلے میں مشرقی معاشرے کو بہتر سمجھتی ہیں۔ اس سلسلے میں وہ لکھتی ہیں:

"مجھے شدت سے احساس ہوا تھا کہ یہ بوڑھے ماں باپ اپنی اولاد کے لیے اتنا بھاری بوجھ کیسے بن گئے جسے برداشت کرنا ان کے لیے ممکن نہیں رہا۔ اپنوں سے جدائی کے بعد ان بجھتی آنکھوں سے اپنی زندگی کے آخری چند سال یہ کس کے انتظار میں کاٹیں گے۔" (۳۰)

اس باب میں بھی سفر سیاحت کا ذکر ہے، ۱۹۶۸ء ادا جعفری نے تنہا لندن کا سفر کیا ان دنوں لندن میں ان کی بہن رہتی تھیں جن کے پاس وہ بیس دن رہیں، یہ ان کے لندن کے اس سفر کی روداد ہے جو صرف گھومنے پھرنے کی خاطر کیا گیا تھا، لندن شہر جو انھیں پسند نہیں آیا ان دنوں خوبصورت ہو گیا تھا۔ وہ پیرس، روم، جنیوا اور پھر استنبول گئیں، وہاں انھوں نے سلاطین عثمانیہ کے زروجواہر کی نمائش بھی دیکھی، میوزم کی منظر کشی یوں کرتی ہیں:

"شفاف شیشے کی دیوار کے پار شفاف شیشے ہی کے کیس میں چکنی مٹی پر ثبت حضور اکرم ﷺ کا نقش قدم محفوظ ہے۔ آگے بڑھے تو رحل پر قرآن مجید کا وہ نسخہ رکھا ہوا نظر آیا جس کی تلاوت حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ عین اپنی شہادت کے وقت کر رہے تھے۔ کلام پاک اسی صفحے پر کھلا ہوا ہے جہاں حضرت عثمان غنی غنی

رضی اللہ عنہ کے پاک لہو کے چند قطرے گرے تھے۔ سونے کے ایک مقفل صندوق میں رسول اللہ ﷺ کی عبا بھی محفوظ ہے۔ شاید کسی سربراہِ مملکت کی آمد پر یہ صندوق کھولا جاتا ہو۔ ایک جگہ حضور اکرم ﷺ کے ذاتی استعمال میں رہنے والی تلوار بھی موجود ہے۔" (۳۱)

اس باب میں ادا جعفری نے مقدس سرزمین کا جو سفر طے کیا۔ اس کا احوال ہے، وہ ملکوں ملکوں گھومی مگر وہ سب مسافتیں تھیں قرار کا مقام کہیں بھی نہیں تھا، نہ آنکھوں کے لیے اور نہ دل کے لیے۔ پھر وہ وہاں پہنچیں جہاں جا کے کوئی دوسری حسرت نہیں رہتی، ۶۹ء میں انھیں اس منزل پر پہنچنے کی خوشی نصیب ہوئی، مشرق وسطیٰ کے سفر سے واپسی پر پہلی بار عمرے اور اس سے اگلے سال حج کی توفیق اور سعادت نصیب ہوئی۔ اس حوالے سے وہ اپنے احساسات کا اظہار یوں کرتی ہیں:

"یہ بیت اللہ ہے۔ دعائے ابراہیم علیہ السلام ہے۔ امن اور سلامتی کا مرکز، خانۂ کعبہ کے گرد والہانہ طواف کرتے ہوئے لوگ صفا مروہ کی پہاڑیوں کے درمیان بے تابانہ پھیرے لگاتی مخلوق، سب وہیں حاضر تھے۔ مگر کسے معلوم کون کہاں تھا۔ یہ وہ مقام جہاں ہر جانے والا اکیلا ہوتا ہے۔ کتنا ہی مجمع، کیسی ہی بھیڑ ہو، کوئی کسی کے ساتھ نہیں ہوتا اور کبھی کبھی اپنے ساتھ بھی نہیں ہوتا۔"

گیت مرے، آہنگ اس کا ہے
چُنری میری، رنگ اس کا ہے (۳۲)

اس باب میں جنرل ایوب خان اور جنرل محمد یحییٰ خان کے دور حکومت کا ذکر ہے، وہ اپنی یادداشتوں میں کھل کر دونوں ادوار کا ذکر کرتی ہیں، یحییٰ خان کے لائے ہوئے مارشل لا کی خبر وہ واشنگٹن میں سن لیتی ہیں، نیو یارک ٹائمز میں اان کی نجی زندگی اور مشاغل کے بارے میں جس تحقیر آمیز لہجے میں تفصیل شائع ہوئی تھی، انھیں بہت ناگوار گزرا۔ فیلڈ مارشل ایوب خان کے عہد حکومت میں وہ اقوامِ عالم کی نظر میں ملکی صنعت کے فروغ، وقتی طور پر امن و امان پر وہ مطمئن نظر آتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یحییٰ خان کی سیاسی پالیسی کے تحت سقوطِ ڈھاکہ اور ملک میں دولت کی جانبدار تقسیم کے نتیجے میں ہونے والی بے ایمانیوں اور آئین کی منسوخی کا بہت دانش مندانہ نقطہ نظر سے ذکر کرتی ہیں جو ان کی سیاسی بصیرت کا عمدہ ثبوت ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

"جس زمانے میں صدر ایوب کے خلاف لوگوں میں اشتعال پیدا ہوا، اس وقت بھی انھیں صحیح اطلاع دینے والا کوئی نہیں تھا۔ اس وقت ملک میں عشرہ ترقی منایا جا رہا تھا۔"(۳۳)

آپ بیتی کا یہ باب خالصتاً مصنفہ کی ذاتی زندگی سے متعلق ہے، اس میں وہ اپنے شوہر نورالحسن جعفری کی ملازمہ اور مختلف شہروں میں ان کے تبادلے اور اس طرح رہائش کے مختلف تجربات پر روشنی ڈالتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنے بچوں میں بیٹی صبیحہ کی شادی، بیٹے عزمی کی جدائی اور ممتا بھرے احساسات کو نہایت دل گیر انداز میں اجاگر کرتی ہیں۔ باب ھذا میں اسلام آباد سے جڑی یادوں کا خاص طور پر ذکر ہے۔ اس باب میں وہ بتاتی ہیں کہ انھوں نے نظم "وداع کی گھڑی سہی" اپنے بیٹے کی جدائی میں لکھی۔ نظم "اس کو نزدیک آنے نہ دو" یہ طویل نظم انھوں نے اپنے بچوں کے علاوہ نئی نسل کے ان تمام بیٹوں اور بیٹیوں کے نام لکھی جنھیں روزی کی تلاش نے پردیسی بنا دیا ہے اور پھر یہی دوری اور جدائی کا احساس دل کو ڈسنے لگتا ہے۔ ان کی ایک نظم "بڑھے ہوئے سائے" کی چند لائنیں ملاحظہ کریں:

اب لوٹ آؤ۔۔۔ دیکھو کہ تمھارے نقش قدم
بھیگی ہوئی گھاس کے سینے پر
اس وقت نمایاں ہیں
ایسا نہ ہو آنسو دھول بنے
اس دھول میں گھر کے آنگن کو
پہچان نہ پاؤ۔۔۔ لوٹ آؤ(۳۴)

اس باب میں سیاحت کا ذکر کیا گیا ہے، اس نے اپنے بچوں کو دیکھنے کے لیے طویل اور صبر آزما سفر بار بار کیے، کبھی وقت کی حدود کو نظر انداز کرتے ہوئے ماضی کی غیر معمولی شخصیات سے غیر معمولی ملاقات ہو جاتی تو کبھی آسائشوں اور شادمانیوں سے چھلکتے ہوئے اس براعظم کے ایسے گوشوں تک بھی جا پہنچتی ہیں، انھوں نے امریکہ کی تاریخی میوزیم، پارکوں، ریستوراں، یادگاروں اور نامور شخصیات سے وابستہ عمارات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

انھوں نے امریکی ریاست پینسلوینیا کا مشہور شہر فلاڈیلفیا کا ذکر کیا ہے، اس شہر کی تمام پرانی عمارتیں سرخ اینٹیں کی بنی ہوئی ہیں، جو اپنی جانب متوجہ کر رہی ہیں، اس شہر میں ۴ جولائی

۱۷۷٦ء کو ایک بہت بڑی گھنٹی بجا کر آزادی کا اعلان کیا گیا تھا، اس گھنٹی پر علان آزادی کندہ ہے، یہ اعلان جیفرسن اور بنجمن فرینکلن نے تحریر کیا تھا، بعد میں برسوں تک اس گھنٹی کو ۴ جولائی کو بجایا جاتا تھا لیکن اب اسے نمائش کے لیے رکھ دیا گیا ہے، ٹورانٹو کے دوسرے سفر کے بارے میں لکھتی ہیں کہ ۸۲ء میں حفظ الکبیر قریشی کے بلاوے پر وہاں اردو کانفرنس میں شرکت کے لیے گئی تھیں کانفرنس میں فیض احمد فیض، جمیل الدین عالی اور احمد فراز شریک تھے، ہندوستان سے علی سردار جعفری اور دوسرے شاعر تھے، مصنفہ اپنے سفر اور سیاحت کے بارے میں لکھتی ہیں:

> ”خدا کے فضل سے سفر تو میں نے بہت کیے ہیں لیکن سفر نامے لکھنے کی طرف کبھی طبیعت راغب نہیں ہوئی۔ یہ جو چند مقامات کا کچھ نہ کچھ ذکر آ گیا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ خوشیاں بھی میرے شب و روز میں شریک ہیں۔“(۳۵)

خود نوشت کے اس آخری باب ”جو رہی سو بے خبری رہی“ میں انھوں نے اپنے بارے میں بات کی ہے، دیکھا جائے تو ساری آپ بیتی ہی ان کے گرد گھومتی ہے، یہ جو شعر و سخن کا سفر ہے یہ اپنی ذات سے شروع ہوتا ہے اور پھر حسب توفیق حیات اور کائنات تک پہنچتا ہے، اس نے تو صرف لمحۂ موجود سے باتیں کی ہیں، وہ اپنی شاعری کو فن کہنا پسند نہیں کرتیں، ان کے لیے تو شاعری حیات کا منظر نامہ بھی ہے اور پیمان حیات بھی اور وہ جو لڑکی تھی وہ تو اپنے اشعار کی دنیا میں سانس لے رہی تھی، انھوں نے اس سرگزشت میں صرف ان لوگوں کا ذکر کیا ہے اور اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہیں کہیں ان کے نام لکھے ہیں جن سے ملاقاتیں ہوئیں اور بہت عزیز اور محترم نام لکھنے سے بھی رہ گئے، انھوں نے جو راہ سخن میں پیش آنے والی اپنی ذاتی دشواریوں کا ذکر کیا ہے اس سے ان کا مطلب ہرگز نہیں کہ اردو شعر و ادب کی دنیا میں ان سے پہلے کسی عورت نے شاعری نہیں کی بلکہ ان سے قبل وہ اپنی پیش رو شاعرات میں ماہ لقا چندہ اور ز۔خ۔ش کا بطورِ خاص ذکر کرتی ہیں۔

جب انھوں نے شعر کہنا شروع کیے وہ ترقی پسند ادب کے عروج کا زمانہ تھا، وہ اس کی باقاعدہ ممبر کبھی نہیں رہی مگر ان دھندلکوں میں جہاں وہ تھی نئے شعر و ادب کا خود بخود اعتماد مزاج اور لیجہ ان کے لیے ایک نئے موسم کا سندیسہ تھا۔ ”میں ساز ڈھونڈتی رہی“ ان کی پہلی کتاب ہے جو ۴۷ء میں مرتب کر کے ناشر کو بھیج دی گئی جو ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی، ان کی شاعری میں بغاوت کے منصب پر فائز عورت کبھی نہیں ملے گی۔

ادا جعفری کی خود نوشت میں ان کے سیاسی اور سماجی شعور کی بے شمار جھلکیاں دیکھی جا سکتی ہیں ، انھوں نے نہ صرف تقسیم ہند سے قبل کے ہندوستانی معاشرے کی سماجی اور سیاسی صداقتوں کی عکاسی کی ہے بلکہ تاریخ کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ وقت کی لہروں میں پڑنے والے بھنور اور مد و جزر کو بھی کسی نہ کسی طور پر اپنے قلم کی گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے، ہر خود نوشت سوانح کا مرکزی کردار انسان کی اپنی ذات ہی ہوتی ہے اور تمام واقعات اور تفصیلات اسی کی شخصیت کے گرد گھومتے ہیں ، مگر مصنفہ نے اپنے ذکر میں کہیں بھی اس انتہا کو نہیں چھوا جسے ہم ''خود پسندی'' یا ''نرگسیت'' کہتے ہیں۔

''جو رہی سو بے خبری رہی'' میں معانی کا دریا بھی رواں ہے اور زبان و بیان کی نہر بھی بہہ رہی ہے، یہ صرف معلومات کا خزینہ ہی نہیں ، ادبی لطافت کا مرقع بھی ہے، نثر کے لیے سادگی، سلاست، اختصار و جامعیت، قطعیت، صراحت اور وضاحت کی جتنی شرطیں درکار ہیں ان پر نقش حیات سو فی صد نہیں تو ننانوے فی صد ضرور پوری اترتی ہے، مشکل سے مشکل مضمون کو انھوں نے آسان جملوں میں قلم و قرطاس کے حوالے کر دیا جو زبان و بیان پر ان کی مہارت کی دلیل ہے۔

خود نوشت کا عنوان گویا ساری کہانی کا لبِ لباب ہے جو ان کی حیات، جذبات و احساسات اور تجربات سے وابستہ ہے۔ وہ واقعات کے اظہار میں نہایت جرأت مندانہ انداز سے غیر جانبدارانہ تبصرہ کرتی ہیں اور شخصیات کے تذکرے میں یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ان کا ہمیشہ اچھے لوگوں سے واسطہ پڑا ہو۔ یہ ان کے مثبت رویے کی عکاسی کرتا ہے۔

ادا جعفری نے اپنی خود نوشت میں جو طرزِ بیان اختیار کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف اچھی شاعرہ ہیں بلکہ اعلیٰ پائے کی نثر نگار بھی ہیں۔ ان کی نثر میں شعریت کا احساس ہوتا ہے۔ خود نوشت کے بیشتر ابواب کے عنوانات سے بھی ان کے شعری ذوق کا اندازہ ہوتا ہے مثلاً ''سفر ہے شرط''، ''ورنہ سفر حیات کا بے حد طویل تھا''، ''ایک سب آگ ایک سب پانی''، '' قریہ بہ قریہ کُوبہ کُو'' وغیرہ وغیرہ۔ خود نوشت کے بارے میں معروف شاعرہ فاطمہ حسن رقم طراز ہیں:

> ''میں بہت متاثر ہوں۔ ہم ادا کو بہ حیثیت شاعرہ پہچانتے تھے مگر جب خود نوشت پڑھی تو اندازہ ہوا کہ وہ بہت وسیع المطالعہ ہیں جس کو انھوں نے اپنے تجربات کے ساتھ ''جو رہی سو بے خبری رہی'' میں بیان کر دیا ہے۔''(۳۶)

مختصر یہ کہ ادا جعفری کی خود نوشت مختلف جہانوں کی سیر کراتی ہے۔ قاری ان کی جادو بیانی کے زیرِ اثر کتاب کو پڑھتے ہوئے خود کو ایک کردار محسوس کرتا ہے اور ان کے ساتھ ساتھ ہر مقام پر خود کو دیکھتا ہے۔ بلاشبہ ان کی خود نوشت ''جو رہی سو بے خبری رہی'' کو بہترین خود نوشت قرار دیا جاسکتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ادا جعفری، جو رہی سو بے خبری رہی، کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۱۳ء، ص ۱۵

۲۔ فاطمہ حسن، دیباچہ، غزل نما، ادا جعفری، کراچی: انجمن ترقیٔ اردو، پاکستان، ۲۰۱۶ء

۳۔ ممتاز مفتی، ادا جعفری، مشمولہ: الفاظ، دوماہی، علی گڑھ، جنوری، فروری، ایڈیٹر: نور الحسن نقوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۶ء، ص ۱۰

۴۔ احمد حسین صدیقی، دبستانوں کا دبستان، کراچی: فضلی بک، ۲۰۰۳ء، ص ۴۸

۵۔ علیم صبا نویدی، پاکستان میں اردو شاعری، مشمولہ: نور جنوب سہ ماہی، چنئی، ۲۰۰۸ء، ص ۱۰۵

۶۔ شہید حسین بدایونی، تذکرہ شعرائے بدایوں، کراچی: انجمن بدایوں، ۱۹۸۷ء، ص ۷۰

۷۔ ادا جعفری: جو رہی سو بے خبری رہی، ص ۸۔۹

۸۔ ایضاً، ص ۲۴

۹۔ ایضاً، ص ۲۹

۱۰۔ ایضاً، ص ۳۳

۱۱۔ ایضاً، ص ۳۵

۱۲۔ خط سلمان غازی، ممبئی: ۱۸ مئی ۲۰۰۳ء ادا کے نام

۱۳۔ ایضاً، ص ۴۵

۱۴۔ ایضاً، ص ۶۵

۱۵۔ ایضاً، ص ۷۸

۱۶۔ ایضاً، ص ۹۳

۱۷۔ ایضاً، ص ۹۷

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۰۳

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۰۴

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۱۸

۲۱۔ ادا جعفری، شہر درد، لاہور: غالب پبلشرز، ۱۹۶۷ء، ص ۱۴۳

۲۲۔ ادا جعفری، جو رہی سو بے خبری رہی، ص ۱۳۸

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۴۴

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۵۴۔۱۵۳

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۵۶۔۱۵۵

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۹۵

۲۷۔ ایضاً، ص ۲۱۷

۲۸۔ ایضاً، ص ۲۲۷

۲۹۔ ایضاً، ص ۲۵۳

۳۰۔ ایضاً، ص ۲۷۷

۳۱۔ ایضاً، ص ۲۹۱

۳۲۔ ایضاً، ص ۲۹۹

۳۳۔ ایضاً، ص ۳۰۷

۳۴۔ ایضاً، ص ۳۲۱

۳۵۔ ایضاً، ص ۳۸۵

۳۶۔ انٹرویو، فاطمہ حسن، شازیہ بتول، معلوماتِ ادا جعفری، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۸ دسمبر ۲۰۱۷ء